کفن

پریم چند

پہلی بار: "جامعہ "دسمبر 1935میں شائع ہوا۔

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اوراندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہوگیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہوگیا جا دیکھ تو آ۔''

مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں۔''

''تو بڑا بے درد ہے بے، سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی۔

''تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹو بھر چلم پیتا۔ اس لیے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا جب تک وہ پیسے رہتے دونون اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کے گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے، مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق اُمید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اونکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا

دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردزہ سے مر رہی تھی۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ ''جا کر دیکھ کیا حالت ہے اس کی چڑیل کا پھنساؤ ہوگا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا۔ ''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا ہے؟ میں تو یہاں ہوں ہی۔''

''تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔''

''میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔''

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ گڑ، تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔''

''سب کچھ آئے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے۔ گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔''

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اُٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھا اسی لیے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل

آتے۔ گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا ''وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی سٹپنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری، دہی، چٹنی، مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ ''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔''

''اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔''

''تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔''

''بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔''

''میں پچاس کھا جاتا۔''

''پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔''

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے۔ جیسے دو بڑے کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت

کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔''

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ''سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارجو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا سب دوا دارو میں اُٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں۔''؟

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں۔ چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش۔'' مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔''

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس واس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آکر دیکھتی تھیں اور اس کے بےبسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتیں۔

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ ''لکڑی تو اسے جلانے بھرنے کو مل گئی ہے کیوں مادھو'

مادھو بولا'' ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیئے۔''

''تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔''

''ہاں اور کیا لاش اُٹھتے اُٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔''

''کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیئے۔''

''کپھن لاس کے ساتھ جل تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا ہے یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ

فیصلے کے مطابق اندر گئے اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی۔ کچھ گزک اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا۔ ''کپھن لگانے سے کیا ملتا جل ہی تو جاتا کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔''

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہوں۔

''دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں۔

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے، پھونکیں، ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔''

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دیں گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے''؟

گھیسو ہنسا ''کہہ دیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔''

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔

''بڑی اچھی تھی بیچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلون میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہوگا۔''

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی ''جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جاتا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔''

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

''کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔''

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف ملامت انداز سے دیکھا۔

''جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمہارا سر۔''

''پوچھے گی تو جرور۔''

''تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔''

مادھو کو یقین نہ آیا بولا۔ ''کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔''

گھیسو تیز ہو گیا۔ ''میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔''

''کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں۔''

''وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا، ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پیئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا ہوا میں نشہ، کتنے تو چلو میں او ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لیے شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ در گور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزالے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ''دینے'' کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ ''لے جا کھوب کھا اور اسیر باد دے، جس کی کمائی تھی وہ تو مر گئی مگر تیرا اسیر باد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔''

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بیکنٹھ میں جائے گی دادا۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔''

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ ''ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی کسی کو ستایا نہیں کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں۔ اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔ تلوّن نشے کی خاصیت ہے یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا۔ ''مگر دادا بیچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ کیوں روتا ہے بیٹا کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔''

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محوِ تماشا تھا اور یہ دونوں مے کش محویت میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اُچھلے بھی، کودے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

سَتیِ

پہلی بار: ''چندن'' لاہور، مئی 1932 میں شائع ہوا۔
کتابی صورت میں: 1934 (آخری تحفہ)

مُلیا کو دیکھتے ہوئے اس کا شوہر کلّو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مُلیا خوش وخوم ہے اور کلّو مغموم اور متفکر؟ مُلیا کو کوڑی ملی ہے۔ اسے دوسرا کون پوچھے گا۔ کلّو کو جواہر ملا ہے۔ اس کے سیکڑوں خریدار ہو سکتے ہیں۔ خاص کر اسے اپنے چچازاد بھائی راجہ سے بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ خوب صورت ہے اور رنگین مزاج۔ باتیں کرنے میں چالاک ہے اور عورتوں کو جھانا خوب جانتا ہے۔ اس لیے کلّو مُلیا کو باہر نہیں نکلنے دیتا۔ اس پر کسی کی نظر بھی پڑ جائے، یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اب شب وروز محنت کرتا ہے تاکہ مُلیا کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو۔ اُسے نہ جانے کس جزائے خیر میں یہ عورت ملی ہے اور وہ اس پر دل وجان قربان کر دینا چاہتا ہے۔ مُلیا کا کبھی سر بھی دکھتا ہے تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔ مُلیا کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک کلّو گھر واپس نہیں آتا ماہی بے آب بنی رہتی ہے۔ گاؤں میں کتنے ہی نوجوان ہیں جو مُلیا سے چھیڑ کیا کرتے ہیں، مگر اس کی نظر میں بدصورت کلّو دنیا کے ہر انسان سے بہتر ہے۔

ایک دن راجہ نے کہا ''بھائی، بھیا تمہارے قابل نہیں ہیں۔''

مُلیا نے فوراً جواب دیا۔ ''قسمت میں تو وہی لکھے تھے، تمہیں کیونکر پاتی؟''

راجہ نے دل میں سوچا۔ اب مار لیا۔ ''بھگوان نے بھی تو غلطی کی ہے۔''

مُلیا مسکرا کر بولی۔ ''اپنی غلطی کو وہی ٹھیک کرے گا۔''

راجہ خوش ہو گیا۔

(2)

تیج کے دن کلّو مُلیا کے لیے لٹھے کی ساڑھی لایا۔ جی تو چاہتا تھا کہ، کوئی عمدہ سی ساڑھی لے، مگر روپے نہ تھے اور بزاز نے آدھار نہ مانا۔

راجہ بھی اسی دن قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ ایک عمدہ سی چندری لا کر مُلیا کی نذر کی۔

مُلیا نے کہا۔ ''میرے لیے تو ساڑھی آ گئی ہے۔''

راجہ نے کہا۔ ''میں نے دیکھی ہے۔ جبھی تو اسے لایا ہوں۔ وہ تمہارے لائق نہیں۔ بھیا کو کفایت بھی سُوجھتی ہے تو ایسی باتوں میں۔''

مُلیا نے ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ''تم سمجھا کیوں نہیں دیتے۔''

راجہ پر ایک پیالے کا نشہ چڑھ گیا۔ بولا ''بڑھا طوطا کہیں پڑھتا ہے۔''

مُلیا۔ ''مجھے تو لٹھے کی ساڑھی پسند ہے۔''

راجہ۔ ''ذرا یہ چندری پہن کر تو دیکھو کیسی کھلتی ہے۔''

مُلیا۔ ''جو لٹھا پہنا کر خوش ہوتا ہے وہ چندری پہننے سے خوش نہ ہوگا۔ اسے چندری پسند ہوتی تو وہ چندری ہی لاتا۔''

راجہ۔ ''انہیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

مُلیا نے تعجب سے کہا۔ ''تو کیا میں اس سے بغیر پوچھے لے لوں گی؟''

راجہ۔ ''اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے؟ جب وہ کام پر چلے جائیں، تب پہن لینا۔ میں بھی دیکھ لوں گا۔''

مُلیا قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولی۔ ''یہ نہ ہوگا دیور جی، کہیں دیکھ لیں تو میری شامت ہی آجائے۔ اسے تم لیتے جاؤ۔''

راجہ نے بضد ہو کر کہا۔ ''ایسے نہ لوگی بھابی تو میں زہر کھا کر سو رہوں گا۔''

مُلیا نے ساڑھی اُٹھا کر طاق پر رکھ دی اور بولی یہ لو اب تو خوش ہو۔''

راجہ نے انگلی پکڑی۔ ''ابھی تو بھیا نہیں ہیں، ذرا پہن لو۔''

مُلیا نے اندر جا کر چندری پہن لی اور پھول کی طرح مہکتی دمکتی باہر آئی۔

راجہ نے بازو پکڑنے کو ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ایسا جی چاہتا ہے، کہ تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔''

مُلیا نے اسی سرور انگیز انداز سے جواب دیا۔ ''جانتے ہو تمہارے بھیا کا کیا حال ہوگا؟''

یہ کہہ کر مُلیا نے کواڑ بند کر لیے۔

راجہ کو ایسا ہوا، گویا سامنے سے پروسی ہوئی تھالی اٹھا لی گئی ہو۔

(3)

مُلیا کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ کلّو کو دکھا دے، مگر نتیجہ سوچ کر ہمیت نہ پڑتی تھی۔ اس نے چندری رکھ کیوں لی؟ اسے اپنے اوپر غصہ آ رہا ہے، لیکن راجہ کو کتنا رنج ہوتا؟ کیا ہوا اس کی چندری ذرا دیر پہن لینے سے اس کا دل تو رہ گیا۔ لیکن اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ ایک کیڑا جیسے اسے متھ رہا تھا۔ اس نے کیوں چندری رکھ لی؟ کیا یہ کلّو کے ساتھ دغا نہیں تھی۔ اس کا دل اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا۔ دغا کیوں ہوئی؟ اس میں دغا کی کون سی بات ہے؟ کیا وہ راجہ سے بولی۔ ذرا سا ہنس دینے سے اگر کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟

کلّو نے پوچھا۔ ''آج راجہ کیا کرنے آیا تھا؟''

مُلیا کا بدن کانپنے لگا۔ بہانہ کر کے بولی ''تمبا کو مانگنے آئے تھے۔''

کلّو نے ناک سکوڑ کر کہا۔ ''اسے اندر مت آنے دیا کرو۔ اچھا آدمی نہیں ہے۔''

مُلیا۔ ''میں نے کہہ دیا تمبا کو نہیں ہے تو چلے گئے۔''

کلّو نے کسی قدر تیز ہو کر کہا۔ ''کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ وہ تمبا کو مانگنے نہیں آیا۔''

مُلیا۔ ''تو اور یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

کلّو۔ ''اور کسی کام سے آیا ہو، مگر تمبا کو مانگنے نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا۔ میرے گھر میں تمبا کو نہیں ہے۔ میں تمبا کو کے لیے خود ہی اس کے گھر گیا تھا۔''

مُلیا کے دن میں کاٹو تو خون نہیں۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ سر جُھکا کر بولی۔ ''میں کسی کے من کا حال کیا جانوں؟''

آج تیج کا برت تھا۔ مُلیا پوجا کا سامان کر رہی تھی۔ پر اس طرح گویا اس کے دل میں ذرا بھی اعتقاد ذرا بھی شوق نہیں ہے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا اس کے منہ میں لکھ پُت گئی ہو اور وہ کلّو کی آنکھوں سے گر گئی ہے۔ اسے اپنی زندگی ویران نظر آتی ہے۔

سوچنے لگی۔ بھگوان نے مجھے یہ حسن کیوں دیا؟ یہ رُوپ نہ ہوتا تو، راجہ کیوں میرے پیچھے پڑتا اور کیوں آج میری یہ حالت ہوتی۔ میں کالی اور بدصورت ہو کر اس سے کہیں زیادہ سکھی ہوتی۔ تب تو دل اتنا چنچل نہ ہوتا۔ جنہیں روپ کی کمائی کھانی ہو وہ رُوپ کو لے جائیں یہاں اس نے زندگی برباد کر دی۔

نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ دیکھتی ہے کلّو مر گیا اور راجہ گھر میں گھس کر اسے پکڑنا چاہتا ہے۔ اسی وقت ایک بوڑھی عورت نہ جانے کدھر سے آ کر اُسے گود میں لے لیتی ہے اور کہتی ہے تو نے کلّو کو کیوں مار ڈالا؟''

مُلیا رو رو کر جواب دیتی ہے۔ میں نے انہیں نہیں مارا۔''

بڑھا جواب میں کہتی ہے۔ ''ہاں تو نے اسے چھری کٹارے نہیں مارا۔ لیکن تیری دغا کٹار سے زیادہ قاتل تھی۔''

مُلیا رو دی۔

مُلیا نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو سامنے صحن میں کلّو سو رہا تھا۔ وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس گئی اور اس کی چھاتی پر سر رکھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کلّو نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟ مولا کیوں روتی ہو؟ کیا ڈر گئیں۔ میں تو جاگ ہی رہا تھا۔''

مُلیا نے سسکی لے کر کہا۔ ''مجھ سے آج ایک خطا ہو گئی، اسے معاف کر دو۔''

کلّو اُٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے؟ کہو تو کیوں روتی ہو؟''

مُلیا۔ ''راجہ تمبا کو مانگنے نہیں آیا تھا۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔''

کلّو ہنس کر بولا۔ ''وہ تو میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا۔''

مُلیا۔ ''وہ میرے لیے ایک چندری لایا تھا۔''

’’تم نے لوٹا دی نا؟‘‘
مُلیا کانپتے ہوئے بولی۔’’میں نے لے لی۔ کہتے تھے، میں زہر کھالوں گا۔‘‘
کلّو لمبی سانس لے کر چار پائی پر گر پڑا، اور بولا۔’’روپ تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔بھگوان نے بدصورت بنادیا تو سُندر کہاں سے ہو جاؤں۔‘‘
کلّو نے اگر مُلیا کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا ہوتا، تو بھی اسے اتنا درد نہ ہوتا۔

(4)

کلّو اس دن سے کچھ کھویا کھویا سار ہنے لگا۔زندگی میں نہ وہ شوق رہا، نہ مزا۔ ہنسنا بولنا گویا بھول گیا۔مُلیا نے اس کے ساتھ جتنی دغا کی تھی، اس سے کہیں زیادہ اس نے سمجھ لیا اور یہی شبہ اس کے دل میں سرطان کی طرح چمٹ گیا۔ وہ گھر اب اس کے لیے صرف اٹھنے بیٹھنے کی جگہ تھی اور مُلیا صرف کھانا پکانے والی مشین۔حظِ نفس کے لیے وہ کبھی کبھی تاڑی خانے چلا جاتا یا چرس کے دَم لگاتا۔
مُلیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی تھی۔وہ اس شبہ کو اس کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی، اس لیے دل وجان سے اس کی خدمت کرتی، اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہتی، مگر وہ جتنا ہی اسے کھینچنے کی کوشش کرتی اتنا ہی دور وہ اس سے کھنچتا تھا۔ گویا کوئی کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی ہو۔غنیمت یہ ہوئی کہ راجہ جس انگریز کے یہاں نوکر تھا اس کا تبادلہ ہو گیا۔اور وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔نہیں تو دونوں بھائیوں میں سے کسی نہ کسی کا ضرور خون ہو جاتا۔اس طرح سال بھر اور گزر گیا۔
ایک دن کلّو رات کو گھر لوٹا تو اس کو بخار تھا۔دوسرے دن اس کے جسم میں دانے نکل آئے۔مُلیا نے خیال کیا ماتا ہے۔مان منوتی کرنے لگی۔مگر چار پانچ دن میں دانے بڑھ کر آبلے ہو گئے، اور معلوم ہوا یہ ماتا نہیں، گرمی ہے۔کلّو کی خرمستی یہ رنگ لائی تھی۔
بیماری سیلاب کی رفتار سے بڑھنے لگی۔آبلوں میں مواد پڑ گیا اور ان میں سے ایسی بدبو نکلنے لگی کہ پاس بیٹھتے ناک پھٹتی تھی۔دیہات میں جس طرح کا علاج ہو سکتا تھا وہ مُلیا کرتی تھی۔مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور کلّو کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔علاج کے لیے پیسے کی بھی ضرورت اور مُلیا کو اب محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔کلّو ادھر اپنے کیے کا پھل بھوگ رہا تھا، مُلیا اُدھر دوادارو میں مری جارہی تھی۔اگر کچھ صبر تھا تو یہی کہ کلّو کا اندیشہ اور شبہ اس کی خدمت گزاری سے دور ہوتا جاتا تھا۔اسے یقین ہو رہا تھا کہ مُلیا اب بھی اسی کی ہے۔وہ اگر کسی طرح اچھا ہو جاتا تو پھر اسے دل میں رکھتا اور اس کی پرستش کرتا۔
صبح کا سہانا وقت تھا۔مُلیا نے کلّو کا ہاتھ منہ دُھلا کر دوا پلائی اور کھڑی پنکھا جھل رہی تھی کہ کلّو نے آنکھ میں آنسو بھر کر کہا۔’’مولا میں نے پچھلے جنم میں کوئی بھاری تپ کیا تھا کہ تم مجھے مل گئیں۔اگر تمہاری جگہ مجھے دنیا کا راج بھی ملے تو نہ لوں۔‘‘
مُلیا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر لیا اور بولی۔’’اگر اس طرح کی باتیں کرو گے تو میں

رونے لگوں گی۔ میں بڑی قسمت ور ہوں کہ تم جیسا شوہر پایا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ شوہر کے گلے میں ڈال دیئے اور بولی۔ ''بھگوان نے مجھے میر ے پاپوں کا بدلہ دیا ہے۔''

کلّو نے پُرخلوص نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''سچ کہو مولا، راجہ اور تم میں کیا معاملہ تھا؟''

مُلیا نے حیرت میں آ کر کہا۔ ''میرے اور راجہ کے درمیان اگر کوئی اور معاملہ ہو تو بھگوان میری اس سے بُری حالت کریں۔ اس نے مجھے چندری دی تھی، وہ میں نے لے لی، پھر میں نے اسے آگ میں جَلا دیا۔ تب سے میں اس کے ساتھ نہیں بولی۔''

کلّو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''میں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا تھا۔ نہ جانے میری سمجھ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ تمہیں پاپ لگا کر خود ہی پاپ میں پھنس گیا اور اب اس کا پھل بھوگ رہا ہوں۔''

اس نے رو رو کر اپنی بے راہ روی کا پردہ فاش کرنا شروع کر دیا اور مُلیا آنسوؤں کی لڑیاں بہا بہا کر سننے لگی، اگر شوہر کی فکر نہ ہوتی تو اس نے زہر کھا لیا ہوتا۔

کئی مہینے بعد راجہ چھٹی لے کر آیا اور کلّو کی مہلک بیماری کا حال سنا تو بہت خوش ہوا۔ تیمارداری کے بہانے سے کلّو کے گھر آنے جانے لگا۔ کلّو اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیتا، لیکن وہ دن میں دو ایک بار پہنچ ہی جاتا تھا۔

ایک دن مُلیا کھانا پکا رہی تھی کہ راجہ نے رسوئی خانے کے دروازے پر آ کر کہا۔

بھابی، کیا اب بھی مجھ پر مہربانی نہ ہو گی؟ کتنی بے رحم ہو تم؟ کئی دن سے میں تمہیں تلاش کر رہا ہوں مگر تم مجھ سے بھاگتی پھرتی ہو۔ بھیّا اب اچھے نہ ہوں گے، انہیں گرمی ہو گئی ہے، ان کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کر رہی ہو۔ تمہارا گلاب سا بدن سوکھ گیا ہے۔ میرے ساتھ چلو، کچھ زندگی کے مزے اڑائیں۔ یہ جوانی بہت دن نہ رہے گی۔ یہ دیکھو تمہارے لئے ایک کرن پھول لایا ہوں۔ ذرا پہن کر مجھے دکھا دو۔''

اس نے کرن پھول مُلیا کی طرف بڑھا دیا۔ مُلیا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں، چولھے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''لالہ تمہارے پیروں پڑتی ہوں، مجھے مت چھیڑو۔ یہ ساری مصیبت تمہاری ہی لائی ہوئی ہے۔ تم ہی میرے دشمن ہو، پھر بھی تمہیں شرم نہیں آتی۔ کہتے ہو بھیا اب کس کام کے ہیں؟ مجھے تو اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ تب میں نہ ہوتی تو وہ دوسری لگائی کر لیتے۔ اپنے ہاتھوں ٹھونک کھاتے۔ آج میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ وہ میرے سہارے زندہ ہیں۔ اگر مصیبت میں میں ان سے دغا کروں تو مجھ سے بڑھ کر پاپی اور کون ہوگا اور جب میں جانتی ہوں کہ اس مصیبت کا کارن بھی میں ہی ہوں۔''

راجہ نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تو وہی ہوا جیسے کسی کی دال گر گئی تو اس نے کہا کہ مجھے تو سوکھی ہی اچھی لگتی ہے۔''

مُلیا نے نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''تم ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو۔ بکتے کیا ہو، اُجلے کپڑے اور چکنے مکھڑے سے کوئی آدمی نہیں ہو جاتا۔ میری آنکھوں میں تو اب ان کے سامنے کوئی جچتا ہی نہیں۔''

کلّو نے پکارا۔ ''مولا تھوڑا پانی دے۔''

مُلیا پانی لے کر دوڑی۔ چلتے چلتے کرن پھول ایسا ٹھکرایا صحن میں جا گرا۔ راجہ نے جلدی سے کرن پھول اُٹھالیا اور غصہ میں چلا گیا۔

(5)

کلّو کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ معقول علاج ہوتا تو شاید اچھا ہو جاتا۔ مگر اکیلی مُلیا کیا کیا کرتی۔ غریبی میں کوڑھ میں کھاج ہے۔

آخر ایک دن ملک الموت کا پیغام آ ہی پہنچا۔ مُلیا گھر کا کام کاج کر کے آئی تو دیکھا کلّو کی سانس زور زور سے چل رہی ہے۔ گھبر کر بولی۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

کلّو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ہاتھ جوڑے اور سر نیچا کر لیا۔ یہ دم واپسیں تھا۔

مُلیا اس کے سینے پر سر رکھ رونے لگی اور ہذیان کے عالم میں بولی۔

''تم سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا بھگوان، اور اس پر دَیالو کہلاتے ہو۔ اسی لیے مجھے پیدا کیا تھا، یہی تماشا دکھانے کے لیے! اے میرے سرتاج، تم تو اتنے بے درد نہ تھے۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جا رہے ہو۔ ہائے اب کون مولا کہہ کر پکارے گا؟ اب کس کے لیے کنوئیں سے پانی بھر کر لاؤں گی؟ کسے بٹھا کر کھلاؤں گی، کسے پنکھا دلاؤں گی؟ بھگوان نے سب کچھ لیا تو، مجھے کیوں نہیں لے چلتے۔

سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ سبھی سمجھا رہے تھے، مُلیا کو صبر نہ ہوتا تھا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ یہ بات اسے نہ بھولتی تھی۔

(6)

کلّو کو مرے چھ مہینے ہو گئے۔ مُلیا کماتی ہے، کھاتی ہے اور اپنے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی۔ ہاں رات کو اکیلے میں بیٹھ کر کچھ دیر رو لیا کرتی ہے۔

ادھر راجہ کی عورت بھی مر گئی۔ مگر دو ہی چار دن کے بعد وہ پھر چھیلا بنا گھومنے لگا۔ اب اور بھی چھوٹا سانڈ ہو گیا۔ پہلے عورت سے لڑائی ہو جانے کا خوف تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا، اب کے نوکری سے لوٹا، تو سیدھا مُلیا کے گھر پہنچا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولا۔

''بھابی اب تو میری امید پوری کرو گی یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟ اب تو بھیا بھی نہیں رہے اور ادھر میرے گھر والی بھی مر گئی۔ میں نے تو اس کا غم بھلا دیا، تم کب تک بھیا کے نام کو روتی رہو گی۔

مُلیا نے نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بھیا نہیں رہے تو کیا ہوا؟ بھیا کی یاد تو ہے، ان کی محبت تو ہے۔ ان کی صورت تو دل میں ہے، ان کی باتیں تو کانوں میں ہیں۔ میرے لیے وہ اب بھی ویسے ہی جیتے جاگتے ہیں۔ میں اب بھی انہیں ویسا ہی بیٹھا ہوا دیکھتی ہوں۔ پہلے تو بدن کا پیچ تھا، اب تو وہ اور بھی مجھ سے قریب ہو گئے۔ اور جیوں جیوں دن گزریں گے اور بھی قریب ہوتے جائیں گے۔ بھرے پُرے گھر میں دانے کی قدر کون کرتا ہے۔ جب گھر خالی ہو جاتا ہے تب معلوم ہوتا ہے دانا کیا چیز ہے۔ پیسے والے پیسے کی قدر کیا جانیں؟ پیسے کی قدر تب ہوتی ہے جب ہاتھ خالی ہوتا ہے۔ اس وقت آدمی ایک ایک کوڑی دانت سے اُٹھاتا ہے۔ تمہیں بھگوان نے دل ہی نہیں دیا، تم کیا جانو، محبت کیا چیز ہے۔ گھر والی کو مرے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے اور تم سانڈ بنے پھرتے ہو۔ تم مر گئے ہوتے تو اسی طرح وہ بھی اب تک کسی کے پاس چلی گئی ہوتی۔ مگر جانتی ہوں میں مر جاتی تو میرا سرتاج عمر بھر میرے نام کو رویا کرتا۔ ایسے ہی مردوں کی عورتیں ان پر جان دیتی ہیں۔ تم جیسے شہدوں کی قسمت میں دوسروں کا جھوٹا کھانا ہی بدا ہے۔ کھاؤ، مگر خبردار! آج سے میرے گھر میں پاؤں مت رکھنا۔ نہیں تو جان سے ہاتھ دھوؤ گے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔''

اس کے چہرے پر اتنا جلال اور لہجے میں اتنی تندی تھی کہ راجہ کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوئی، چپکے سے نکل گیا۔

☆☆☆

اسی عنوان کی ایک اور کہانی جس کے پس منظر میں بند ملکھنڈ ہے اور ہیروئن کا نام چِنتا دیوں ہے وہ مارچ 1927 میں ہندی ''مادھوری'' میں شائع ہوئی اور 1928 میں اردو میں ''خواب وخیال'' میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

زادِ راہ

پہلی بار: کتابی صورت میں، 1936ء (زادِ راہ)

اس سے قبل کسی رسالے میں شائع ہونے کا علم نہیں

سیٹھ رام ناتھ نے بستر علالت پر پڑے ہوئے مایوس نظروں سے اپنی بیوی سوشیلا کی طرف دیکھ کر کہا ''میں بڑا بدقسمت ہوں، سوشیلا، میرے ساتھ تمہیں ہمیشہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ جب گھر میں کچھ نہ تھا تو شب وروز دنیا داری کے بکھیڑوں اور بچوں کے لیے مرتی رہتی تھی۔ جب معاملہ ذرا کچھ سنبھلا اور آرام کرنے کے دن آئے تو تمہیں چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں۔ آج تک مجھے زندگی کی امید تھی وہ امید جاتی رہی۔ دیکھو سوشیلا روؤ مت، دنیا میں سبھی مرتے ہیں، کوئی دو سال آگے، کوئی دو سال پیچھے۔ اب عیال داری کا بوجھ تمہارے سر پر ہے میں نے نقد روپیہ نہیں چھوڑا، لیکن جو کچھ اثاثہ ہے تمہاری زندگی اس سے کسی طرح کٹ جائے گی۔ یہ موہن کیوں رو رہا ہے؟''

سوشیلا نے آنسو پونچھ کر کہا،''ضدی ہوگیا ہے، اور کیا، آج سویرے سے رٹ لگائے ہوئے ہے کہ موٹر لوں گا۔ پانچ روپے سے کم میں آئے گی موٹر؟''

سیٹھ جی کو کچھ دنوں سے دونوں بچوں سے محبت ہوگئی تھی۔ بولے،''تو منگا دو، ایک بیچارے کو، کب سے رو رہا ہے۔ کیا ارمان دل میں تھے۔ سب خاک میں مل گئے۔ رانی کے لیے ولایتی گڑیا منگوائی دوسروں کے کھلونے دیکھ کر ترستی رہتی ہے۔ جس دولت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھا، وہ آخر کا ڈاکٹروں نے کھائی۔ بچے مجھے کیا یاد کریں گے کوئی باپ تھا، آہ بدقسمت باپ نے تو مال وزر کو لڑکے لڑکی سے پیارا سمجھا۔ ایک پیسہ کی چیز لاکر بھی نہیں دی۔ افسوس!''

آخری وقت جب دنیا کی ناپائیداری حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے جو کچھ نہ کیا اس کا افسوس اور جو کچھ کیا اس کا پچھتاوا دل کو فراخ اور دردمند بنا دیتا ہے۔ سوشیلا نے راجہ کو بلایا اور اسے چھاتی سے لگا کر رونے لگی، وہ ماما جو شوہر کی کنجوس طبیعت کے سبب اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتی تھی اس وقت جیسے ابل پڑی، لیکن موٹر کے لیے روپے کہاں تھے؟

سیٹھ جی نے پوچھا،''موٹر لے لو بیٹا، اپنی ماں سے روپیہ لے کر، بہن کے ساتھ چلے جاؤ۔ خوب عمدہ لانا۔''

موہن نے ماں کے آنسو اور باپ کا پیار دیکھا تو اس کی ضد پگھل گئی۔ بولا۔''ابھی نہیں لوں گا۔'' سیٹھ جی نے پوچھا، کیوں؟''

''جب آپ اچھے ہو جائیں گے تب لوں گا۔''

سیٹھ جی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

(2)

تیسرے روز سیٹھ رام ناتھ دنیا سے رخصت ہوگئے۔

دولت مند کے زندہ رہنے سے دکھ بہتوں کو ہوتا ہے اور سکھ تھوڑوں کو، ان کے مرنے سے دکھ چند کو ہوتا ہے اور سکھ زیادہ کو۔ اب مہابرہمنوں کا گروہ الگ خوش ہے۔ پنڈت جی الگ بشاش ہیں، اور شاید برادری کے لوگ بھی خوش ہیں۔ اس لیے ایک برابر کا آدمی کم ہو گیا۔ دل سے ایک کانٹا نکل گیا اور پٹی داروں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اب وہ پرانی کسر نکالیں گے۔ دل ٹھنڈا کرنے کا ایسا موقع بہت دنوں کے بعد ملا ہے۔

آج پانچواں دن ہے وہ عالی شان مکان سُونا پڑا ہے، بچے نہ روتے ہیں نہ ہنستے ہیں من مارے ماں کے پاس بیٹھے ہیں، گھر میں جو روپے بچ رہے تھے وہ تجہیز و تکفین کی نذر ہو گئے اور ابھی سارے رسوم باقی ہیں۔ خدا کیسے بیڑا پار لگائے گا۔

کسی نے دروازہ پر آواز دی۔ مہرانے آکر سیٹھ دَھنی رام کے آنے کی خبر دی۔ دونوں بچے باہر دوڑے سوشیلا کا دکھ بھی ایک لمحہ کے لیے تازہ ہو گیا۔ سیٹھ دَھنی رام برادری کے چودھری تھے بیکس بیوہ کا دل

سیٹھ جی کی اس دل جوئی سے خوش ہو گیا۔ آخری برداری کے سرپنچ ہیں۔ وہ لوگ بیکس، بیوہ اور یتیم بچوں کی خبر نہ لیں تو اور کون لے۔ آفریں ہے ایسے نیک بندوں پر جو مصیبت کے وقت بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ سوشیلا گھونگھٹ نکال کر برآمدہ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھا تو علاوہ دھنی رام کے اور بھی کئی بھلے کھڑے ہیں۔

دھنی رام بولے۔ ''بہو جی! بھائی رام ناتھ کی بے وقت موت سے ہم لوگوں کو رنج ہوا ہے۔ وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی۔ لیکن پر ماتما کی مرضی۔ اب تو ہمارا یہی فرض ہے کہ پرمیشور پر بھروسہ رکھیں اور آگے کے لیے کوئی راستہ نکالیں۔ کام ایسا کرنا چاہیے کہ گھر کی عزت ہی رہے اور ہمارے مرحوم بھائی کی روح کو تسکین ہو۔''

کبیر دا سنے سوشیلا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''عزت کے سوا دنیا میں اور ہے کیا، اس کو نبھانا، اس کی حفاظت کرنا ہمارا دھرم ہے لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہئے۔ کتنے روپے تمہارے پاس ہیں بہو؟''

سوشیلا: ''گھر میں روپے کہاں ہیں سیٹھ جی، جو تھوڑے بہت تھے، بیماری میں اٹھ گئے۔''

دھنی رام: ''تو یہ نئی الجھن پیدا ہو گئی۔ ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

کبیر چند: ''جو کچھ سہی دعوت تو دینی ہی ہوگی۔ ہاں اپنی بساط دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ میں قرض لینے کی صلاح نہ دوں گا۔ گھر میں جتنے روپے کا انتظام ہو سکے اس میں کوئی کسر نہیں رکھنی چاہیے، مرنے والے کے ساتھ ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے، اب تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس سے ہمیشہ کے لیے رشتہ ٹوٹ رہا ہے اس لیے سب کچھ حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے، برہمنوں کو تو وہی مٹھائیاں دی جائیں گی لیکن برادری کی دعوت اس اعتبار سے کرنی چاہیے کہ عزت میں فرق نہ آئے۔''

دھنی رام، ''تو کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے تو ایک بڑی عجیب بات کہہ دی۔ بہو جی! دو چار ہزار بھی نہیں۔''

سوشیلا: ''میں آپ سے سچ کہتی ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بھلا ایسے وقت جھوٹ بولوں گی۔''

دھنی رام نے کبیر چند کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تب تو یہ مکان بیچنا پڑے گا۔''

کبیر چند: ''اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ناک کٹانا تو اچھا نہیں ہے۔ رام ناتھ کا کتنا نام تھا برادری کے ستون تھے۔ یہی اس وقت ایک علاج ہے۔ بیس ہزار میرے نکلتے ہیں سود بٹہ لگا کر کوئی پینتیس ہزار ہوں گے۔ باقی روٹی میں خرچ ہو جائیں گے۔ اگر کچھ بچ رہا تو بال بچوں کے کام آ جائے گا۔''

دھنی رام: ''آپ کے پاس یہ گھر کتنے میں رہن ہے؟''

کبیر چند: ''بیس ہزار روپیہ سیکڑہ سود۔''

دھنی رام: ''میں نے کم سنا ہے۔''

کبیر چند: ''اس کا تو رہن نامہ رکھا ہے۔ زبانی بات چیت تھوڑی ہے۔ میں دو چار ہزار کے لیے جھوٹ نہ بولوں گا۔''

دھنی: ''نہیں نہیں، یہ میں کب کہتا ہوں، تو تو نے سن لیا بائی۔ پنچوں کی صلاح ہے کہ مکان بیچ دیا جائے۔

سوشیلا کا چھوٹا بھائی سنت لال بھی اس وقت آ پہنچا۔ یہ آخری الفاظ اس کے کان میں پہنچ گئے۔ وہ بول اٹھا ''کس لیے بیچ دیا جائے برادری کی روٹی کے لیے۔ برادری تو کھا پی کر راستہ لے گی۔ ان یتیموں کی کون پرورش کرے گا۔ یہ بھی سوچنا چاہیے۔''

دھنی رام نے غصہ بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ '' آپ کو ان معاملوں میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں صرف آئندہ کی فکر کرنے سے کام نہ چلے گا۔ مرحوم کا پیچھا بھی کسی طرح سدھارنا پڑے گا۔ ہنسی تو ہماری ہوگی دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ وقار کے لیے جان تک قربان کے دیتے ہیں۔ جب وقار ہی نہ رہا کیا رہ گیا۔ اگر ہماری صلاح پوچھو گے تو ہم تو یہی کہیں گے، آگے بائی کو اختیار ہے، جیسا کرے پر ہم سے سروکا نہ ہوگا چلیے کبیر چند جی چلیں۔''

سوشیلا نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ''بھیا کی باتوں کا خیال نہ کیجیے سیٹھ جی! ان کی تو یہ عادت ہے۔ میں نے آپ کی بات نہیں ٹالی۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ گھر کا حال آپ کو معلوم ہی ہے۔ میں اپنے مالک کی روح کی رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی لیکن جب ان کے بال بچے ٹھوکریں کھائیں گے تو، ان کی روح رنجیدہ نہ ہوگی؟ بیٹی کا بیاہ کرنا ہی ہوگا، لڑکے کو لکھانا پڑھانا پڑے گا ہی، برہمنوں کو کھلا دیجیے لیکن روٹی کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔''

دونوں اصحاب کو گویا تھپڑ لگ گیا۔ بھلا ایسی بات کبھی زبان سے نکالی جاتی ہے پنچ لوگ اپنے منہ پر سیاہی نہ لگنے دیں گے۔ دنیا بیوہ عورت پر نہیں ہنسے گی۔ ہنسی ہوگی پنچوں کی۔ یہ جگ ہنسائی وہ کیسے سہہ سکتے ہیں۔ ایسے گھر کے دروازہ پر جھانکنا بھی گناہ ہے۔

سوشیلا رو کر بولی۔ ''میں غریب ہوں، نادان ہوں، مجھ پر غصہ نہ کیجیے۔ آپ لوگ ہی مجھے چھوڑ دیں گے تو میرا گزارہ کیسے ہوگا۔''

اتنے میں اصحاب اور آ گئے۔ ایک بہت موٹے، دوسرے بہت دُبلے، نام بھی اسم بامسمی بھیم چندر اور دربلی داس، دھنی رام نے چند لفظوں میں ساری کیفیت انہیں سمجھا دی اور دربل داس نے بہت ہمدردی سے کہا۔ ''تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہم لوگ مل کر کچھ روپے دے دیں اس کا لڑکا سیانا ہو جائے گا تو روپے مل ہی جائیں گے اگر نہ بھی ملیں تو ایک دوست کے لیے کچھ بلی کھا جانا بڑی بات نہیں۔''

سنت لال نے خوش ہو کر کہا۔ ''اتنی مہربانی آپ لوگ کریں تو کیا کہنا۔''

کبیر چند تیوری چڑھا کر بولے۔ ''تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگے۔ دربل داس جی، اس وقت بازار میں کسی کے پاس فالتو روپے رکھے ہوئے ہیں جو دے دے گا۔ زمانہ کا رنگ نہیں دیکھتے۔''

بھیم چند: ''یہ تو ٹھیک ہے ایسا مندا بازار تو کبھی دیکھا ہی نہیں مگر نبھاؤ تو کرنا چاہیے۔''

کبیر چند اکڑ گئے، وہ سوشیلا کے مکان پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ایسی باتوں سے شکار ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا، وہ اپنے روپے وصول کر کے چھوڑیں گے۔عورتوں کے جھمیلے میں پڑ کر اپنا نقصان کیوں کریں بھیم چند نے بہت اچھا کیا۔انہیں ہوشیار کر دیا لیکن ضیافت تو دینی ہی پڑے گی۔ پنچ لوگ برادری کی ناک نہیں کٹوا سکتے۔

سوشیلا نے دربل داس میں ہمدردی کا شائبہ دیکھا۔ان کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھ کر بولی: ''میں آپ لوگوں سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔آپ لوگ مالک ہیں جیا مناسب سمجھیں کریں۔''

دربل داس نے پوچھا: ''تیرے پاس کچھ تھوڑے، بہت زیور تو ہوں گے؟''

سوشیلا نے قبول کیا۔ہاں تھوڑے سے گہنے پڑے ہیں، بیماری میں آدھے سے زیادہ بک گئے ہیں یہ کہہ کر اس نے سارے زیور لا کر پنچوں کے سامنے رکھ دے۔

دھنی رام بولے'' مگر یہ تو مشکل سے تین ہزار میں اُٹھیں گے۔''

دربل داس نے پوٹلی کو ہاتھ میں تول کر کہا'' تین ہزار کیسے، میں ساڑھے تین ہزار دلا دوں گا۔بھیم چند نے پھر پوٹلی کو جانچ کر کہا۔میری بولی تین ہزار کی ہے۔''

کبیر چند کو مکان کے فروخت کرنے کا سوال چھیڑنے کا پھر موقع ملا، بولے'' چار ہزار میں کیا ہوا جاتا ہے۔ برادری کا کھانا ہے یا کوئی بلا ٹالنا ہے۔کم سے کم دس ہزار کا خرچ ہے مکان تو نکالنا ہی پڑے گا۔''

سنت لال نے ہونٹ چبا کر کہا۔''میں کہتا آپ لوگ کیا اتنے بے رحم ہیں۔آپ لوگوں کو یتیم بچوں پر بھی رحم نہیں آتا۔کیا انہیں بھکاری بنا کر چھوڑیں گے۔''

لیکن سنت لال کی فریاد پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ بلا مکان فروخت کیے کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ بازار آج کل مندا ہے تیس ہزار روپے سے زائد نہیں مل سکتے۔پچیس ہزار تو کبیر داس کے ہیں پانچ ہزار بچیں گیا اس طرح نو ہزار میں بڑی کفایت سے برہم بھوج بھی ہو جائے گا اور برادری کی دعوت بھی ہو جائے گی۔پنچوں کو آخر بال بچوں کا خیال بھی تو کرنا چاہیے۔

سوشیلا نے دونوں کو سامنے کر کے ہاتھ جوڑ کر کہا'' پنچو میرے بچوں کا منہ دیکھو، میرے گھر میں جو کچھ ہے سب لے لیجیے لیکن مکان چھوڑ دیجیے۔ مجھے ٹھکانہ نہ ملے گا۔میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، مکان اس وقت نہ بیچیں۔''

اس بے وقوفی کا کیا جواب دیا جائے۔ پنچ لوگ تو چاہتے تھے کہ مکان نہ بیچنا پڑے انہیں یتیم بچوں سے کچھ دشمنی نہیں لیکن برادری کا کھانا اور کس طریقے سے کیا جائے اگر بیوہ پانچ ہزار کا انتظام اور کر دے تو مکان فی الحال بچ سکتا ہے جب وہ ایسا نہیں کر سکتی تو مکان فروخت کرنے کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

کبیر داس نے کہا،'' دیکھ بائی، بازار کی حالت آج کل خراب ہے، روپیہ کسی سے ادھار نہیں مل سکتا، بال بچوں کے بھاگ میں ہوگا تو بھگوان اور کسی حیلے سے دے دیں گے، حیلہ روزی بہانہ موت،

بھگوان جس کو پیدا کرتے ہیں اس کے رزق کا انتظام بھی کر دیتے ہیں۔ہم تجھے سمجھا کر ہار گئے اگر تو اپنی ہٹ نہیں چھوڑے گی تو ہم بات بھی نہ کریں گے۔پھر یہاں تیرا رہنا مشکل ہو جائے گا۔شہر والے تیرے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

بیوہ سوشیلا اور کیا کرتی، پنچوں سے لڑ کر وہ کیسے رہ سکتی تھی۔پانی میں رہ کر مگرمچھ سے کون دشمنی کر سکتا ہے اندر جانے کے لیے اٹھی مگر وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ابھی تک کچھ امید قائم تھی بچوں کی پرورش میں وہ اپنی بیوگی کو بھول سکتی تھی مگر اب تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔

(3)

سیٹھ رام ناتھ کے دوستوں کا ان کے گھر پر پورا حق تھا، دوستوں کا حق نہ ہو تو کس کا ہو، عورت کون ہوتی ہے جب وہ اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھتی کہ برادری کو روٹی دینا اور دھوم دھام دینا لازمی ہے۔اس کا زیادہ سمجھانا فضول ہے۔اب زیورات کون خریدے۔بھیم چند تین ہزار گنا چکے تھے لیکن اب ان کو معلوم ہوا ان سے بھول ہو گئی تھی۔دربل نے ساڑھے تین ہزار لگائے تھے۔اس لیے سودا انہیں کے ہاتھ میں رہا۔ اس بات پر بھیم چند اور دربلی داس میں ہو گئی لیکن بھیم چند کو منہ کی کھانی پڑی اور انصاف دربل کی طرف تھا۔

دھنی رام نے ذرا چٹکی لی، دیکھو دربل داس مال تو لے جاتے ہو۔مگر ساڑھے تین ہزار سے زائد کا ہے میں انصاف کا خون نہ ہونے دوں گا۔

کبیر داس بولے۔''اجی تو گھر میں ہی تو ہے کہیں باہر تو نہیں گیا۔ایک دن دوستوں کی دعوت ہو جائے گی۔اس پر چاروں اصحاب ہنس پڑے۔اس کام سے فرصت پا کر اب مکان کا سوال اُٹھا۔کبیر داس تیس ہزار دینے پر تیار تھے لیکن قانونی کارروائی کے بغیر معاملہ پختہ نہ تھا۔یہ خامی کیوں رکھی جائے۔ فوراً ایک دلال بلایا گیا۔پستہ قد آدمی، پوپلا منہ، کوئی ستر سال کی عمر، نام تھا چوکھے لال۔''

کبیر داس نے کہا۔''چوکھے لال سے ہماری تیس سال کی دوستی ہے۔آدمی کیا ہے ہیرا ہے۔''

بھیم چند، دیکھو چوکھے لال یہ مکان بیچنا ہے۔اس کے لیے کوئی اچھا خریدار لاؤ۔تمہاری دلالی پکی۔''

کبیر داس۔''بازار کا حال اچھا نہیں ہے لیکن پھر بھی ہمیں تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ رام ناتھ کے بچوں کو خسارہ نہ رہے (چوکھے لال کے کان میں) تیس ہزار سے آگے نہ بڑھنا۔

بھیم چند دیکھیے۔''کبیر داس یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

کبیر داس''تو میں کہہ کیا رہا ہوں۔میں تو یہی کہہ رہا تھا کہ اچھے دام لگانا۔''

چوکھے لال''آپ لوگوں کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔رام ناتھ میرے بھی دوست تھے۔مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مکان کے بنوانے میں ایک لاکھ سے ایک پائی بھی کم خرچ نہیں ہوئی لیکن بازار کا حال کیا آپ لوگوں سے چھپا ہوا ہے اس وقت اس کے پچیس ہزار سے زائد

نہیں مل سکتے۔ سبھیتے سے کوئی گاہک مل جائے تو دس پانچ ہزار اور مل جائیں گے لیکن اس وقت پچیس ہزار بھی بہت ہیں۔''

دھنی رام: ''پچیس ہزار تو بہت کم ہیں بھائی اور نہ سہی تو تیس ہزار تو کرا دو۔''

چوکھے لال ''تیس کیا میں چالیس کر دوں، کوئی گاہک تو ہو، آپ لوگ کہتے ہیں تو میں تیس ہزار کی بات چیت کروں گا۔''

دھنی رام ''جب تیس ہزار میں دینا ہے تو کبیر داس ہی کیوں نہ لے لیں۔ اتنا سستا مال دوسروں کو کیوں دیا جائے۔''

کبیر داس'' آپ سب لوگوں کی جیسی رائے ہو۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ بائی کے ساتھ جہاں تک ہو سکے رعایت کی جائے۔''

دھنی رام جی نے ہاں ہاں کہہ کر منظوری دے دی۔ بھیم چند من میں اینٹھ کر رہ گیا۔

یہ سودا بھی پکا ہو گیا۔ اسی دن وکیل نے بیعنامہ لکھا۔ جھٹ رجسٹری ہو گئی۔ سوشیلا کے سامنے بیعنامہ لایا گیا تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اس پر دستخط کر دیے۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بیوفا دوست کی طرح یہ گھر بھی سکھ کے دنوں میں اس کا ساتھ دے کر دکھ میں ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

پنچ لوگ سوشیلا کے صحن میں بیٹھے برادری کو رقعے لکھ رہے ہیں اور لاوارث بیوہ جھروکے میں اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔ ادھر رقعہ تیار ہوا۔ ادھر بیکس بیوہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رقعے پر گرے۔

دھنی رام نے اوپر دیکھ کر کہا'' پانی کی چھینٹ کہاں سے آئی۔''

سنت رام'' بائی بیٹھی رو رہی ہے۔ اس نے رقعے پر اپنے خون کی آنسوؤں کی مہر لگا دی ہے''

دھنی رام (اونچی آواز میں) ''ارے تو کیوں رو رہی ہے۔ بائی یہ رونے کا وقت نہیں تجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ پنچ لوگ تیرے گھر میں آج نیک کام کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ جس خاوند کے ساتھ تو اتنے عیش و آرام سے رہی اس کی آتما کے لیے کچھ ''زادِ راہ'' دے گی اس کی مکتی کی طرف تیرا ذرا بھی دھیان نہیں؟''

برادری میں رقعہ پھرا، اور پھر تین چار دن پنچوں نے دعوت کی تیاری میں صرف کیے۔ گھی دھنی رام جی کی آڑھت سے آیا۔ میدے اور چینی کی آڑھت بھی انہیں کی تھی، پانچوں دن صبح کے وقت برہمنوں کو کھانا ہوا۔ شام کی برادری کی روٹی ہوئی سوشیلا کے دروازے پر گاڑیوں اور موٹروں کی قطاریں کھڑیں تھیں۔ صحن، بیٹھک، دلان، برآمدہ اوپر کی چھت سب مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ کھانا کھاتے اور پنچوں کی تعریفیں کر رہے تھے۔

''سیٹھ چمپا رام کی روٹی کے بعد ایسی روٹی ہوئی ہے۔''

''امرتیاں کیسی خستہ ہیں۔''

''رس گلے میوے سے بھرے ہیں۔''

''سارا انتظام پنچوں کا ہے۔''

دھنی رام نے انکساری سے کہا۔''رام ناتھ سے بھائی چارہ تھا۔ہم نہ کرتے تو کون کرتا۔ یہ سمجھ لو کہ چار دن سے سونا نصیب نہیں ہوا۔''

''آفریں دوست ہوں تو ایسے ہوں۔''

''کیا بات ہے، آپ نے رام ناتھ جی کا نام رکھ لیا۔ برادری یہی کھانا کھلانا دیکھتی ہے۔رسم کو دیکھنے نہیں آتی۔''

مہمان لوگ تعریفیں کر کے تر مال اڑاتے تھے اور ادھر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی سوشیلا سوچ رہی تھی۔دنیا میں ایسے خود غرض لوگ بھی ہیں ساری دنیا مطلب پرست بن گئی ہے۔سب پیٹوں پر ہاتھ پھیر کر کھانا کھا رہے ہیں۔کوئی اتنا بھی نہیں سوچتا کہ غریب یتیموں کے لیے کچھ بچا، یا نہیں۔''

ایک مہینہ گذر گیا۔

سوشیلا پیسے پیسے کو محتاج ہو رہی تھی۔نقد تھا ہی نہیں، زیور نکل گئے تھے۔اب صرف تھوڑے سے برتن بچ رہے تھے ادھر بہت چھوٹے چھوٹے بل چکانے تھے۔کچھ روپے ڈاکٹر کو دینے تھے کچھ بنیے کو، کچھ درزی کو، سوشیلا کو قمیں گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر چکانا پڑیں۔اور مہینہ پورا ہوتے ہوتے اس کے پاس کچھ نہ بچا۔ بیچارہ سنت لال ایک دکان میں منیم تھا۔کبھی کبھی دو چار روپے دے دیتا اور خرچ کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا ۔ بچے صورت حال کو سمجھتے تھے ماں کو دق نہ کرتے تھے لیکن مکان کے سامنے سے کوئی خوانچے والا نکل جاتا اور دونوں دوسرے بچوں کو پھل یا مٹھائیاں کھاتے دیکھتے تو ان کے منہ میں چاہے پانی نہ آئے، آنکھوں میں ضرور آ جاتا تھا۔ایسی للچائی نظروں سے دیکھتے کہ رحم آ جاتا۔وہی بچے جو چند روز پہلے میوے اور مٹھائی کی طرف تاکتے بھی نہ تھے اب ایک ایک پیسے کی چیز کو ترستے تھے۔وہی حضرات جنہوں نے برادری کو دعوت کروائی تھی، مکان کے سامنے سے نکل جاتے تھے پر کوئی جھانکتا نہ تھا۔

شام ہو گئی تھی۔سوشیلا چولھا جلائے روٹیاں سینک رہی تھی اور دونوں بچے چولھے کے پاس بیٹھے روٹیوں کو گرسنہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔دال پکنے کا انتظار تھا۔لڑکی گیارہ سال کی تھی، لڑکا آٹھ سال کا۔

موہن بے صبر ہو کر بولا ''اماں مجھے روکھی روٹیا ہی دے دو۔ بڑی بھوک لگی ہے۔''

سوشیلا نے محبت آمیز لہجہ میں کہا ''ذرا اور صبر کرو بیٹا، ابھی دال پکی جاتی ہے۔''

ریوتی کو بھائی پر رحم آ گیا، بولی۔''میرے پاس ایک پیسہ ہے وہی لے آتی ہوں۔''

سوشیلا نے پوچھا ''تو نے پیسہ کہاں سے پایا۔''

ریوتی نے معصومانہ انداز میں کہا، ''مجھے کل اپنی گڑیوں کی پٹاری میں ملا تھا۔''

سوشیلا مطمئن ہو کر بولی ''اچھا جا، مگر جلدی آئیو۔''

ریوتی دوڑی ہوئی باہر گئی اور ایک پتے پر ذرا سی دہی لے آئی۔ماں نے روٹی دے دی۔

موہن دہی سے روٹی کھانے لگا۔ عام لڑکوں کی طرح وہ بھی خودغرض تھا۔بہن سے پوچھا بھی نہیں۔

سوشیلا نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔''اکیلا ہی کھا جائے گا یا بہن کو بھی دے گا۔''

موہن شرمندہ ہوگیا۔اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

ریوتی بولی۔''نہیں اماں کتنا ملا ہے۔تم کھا لو۔موہن تمھیں جلد نیند آجاتی ہے۔میں تو دال کے ساتھ کھاؤں گی۔''

اسی وقت دو آدمیوں نے باہر سے آواز دی، ریوتی نے باہر جا کر پوچھا۔معلوم ہوا سیٹھ کبیر داس کے آدمی ہیں مکان خالی کرانے آئے ہیں۔سوشیلا کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں۔

بروٹھے میں آکر بولی۔''ابھی میرے شوہر کی وفات کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور ابھی سے مکان خالی کرانے کی دھن سوار ہوگئی۔میرا پچاس ہزار کا مکان تیس ہزار میں لے لیا، اس پر پانچ ہزار سود کے ہضم کیے پھر بھی پیٹ نہیں بھرا۔کہہ دو، میں ابھی مکان خالی نہ کروں گی۔''

منیم نے ملامت سے کہا۔''بائی جی، میں تو نوکر ہوں۔میرا کیا اختیار ہے۔جب ملکیت دوسرے کی ہوگئی تب آپ کو مجبوراً چھوڑنی ہی پڑے گی۔قانون تو کسی کی حالت کو نہیں دیکھتا۔''

سوشیلا سمجھ گئی۔منیم کیا کہتا ہے۔رحم اور انسانیت کے بل پر کب تک گزارہ ہوگا۔نرم ہو کر بولی''اتنا میں بھی جانتی ہوں منیم جی، تم سیٹھ جی سے میری طرف سے عرض کرنا، دس دن کی مہلت اور دے دیں لیکن کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔کیوں دس دن کے لیے کسی کا احسان لوں۔میری تقدیر میں اس گھر میں رہنا لکھا ہوتا تو کیوں ہاتھ سے نکل جاتا۔''

منیم نے پوچھا''تو کل سویرے تک خالی ہو جائے گا۔''

سوشیلا بولی۔''ہاں ہاں کہتی تو ہوں کہ کل سویرے تک کیوں، ابھی خالی کیے دیتی ہوں۔میرے پاس اپنا اثاثہ ہی کیا ہے۔تمہارے سیٹھ جی کے رات بھر کے کرایہ کا کیوں نقصان ہو، جا کر قفل لاؤ یا لائے ہو۔؟''

''ایسی کیا جلدی ہے بائی جی، کل اطمینان سے خالی کر دیجیے گا۔''

''جب خالی کرنا ہے تو کل کا جھگڑا کیوں رکھوں۔منیم جی آپ جایے اور تالا لا کر ڈال دیجیے۔''

یہ کہتی ہوئی سوشیلا اندر گئی۔بچوں کو کھانا کھلایا۔ایک روٹی خود آنسوؤں کے ساتھ نگلی، برتن مانجھے پھر ایک یکہ منگوا کر اس پر مختصر سامان لادا اور دل میں درد لیے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی جسے اس نے اتنے ارمانوں سے کئی پشتوں کے لیے بنوایا تھا۔اس وقت دل میں کتنی امنگیں تھیں۔اینٹ اول درجہ کی ہو۔چونا خالص کنکر کا لکڑ پختہ۔سیٹھ جی مرحوم تو دن بھر اپنی آڑھت میں رہتے تھے، مزدوروں کی نگرانی اور دیکھ بھال وہ خود کرتی تھی۔جس دن مکان تیار ہوگیا اور آبادی کی رسم ادا ہوئی اس دن کئی ہزار برہمن بھوج ہوا تھا۔سوشیلا کو اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی تھیں۔کہ وہ ایک مہینہ تک بیمار رہی۔''اس گھر سے

اتنے ہی دنوں میں کتنی یادیں وابستہ ہوگئی تھیں اسی گھر میں اس کے دولڑکے مرے تھے۔ یہیں اس کے شوہر نے دنیا کو خیر باد کہا۔ مرنے والوں کی روحیں گویا اس درودیوار پر منڈلا رہی ہوں۔ اس کا ایک ایک کونہ گو اس کے دکھ سے دکھی اور اس کے سکھ سے سکھی ہوتا ہوا معلوم ہوا تھا۔ وہ پرانا رفیق آج اس سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہو رہا ہے۔

اس نے رات ایک ہمسائے کے گھر کاٹی اور دوسرے دن دس روپیہ ماہوار پر ایک گلی میں دوسرا مکان لے لیا۔

(5)

اس نئے مکان میں ان مصیبت زدوں نے تین مہینے جس عذاب میں کاٹے وہ سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جو ہوادار، پُر فضا، وسیع اور ہر موسم میں آرام دہ مکان میں رہنے کا عادی ہو، اس کے لیے یہ نیا مکان تنگ وتاریک زندان خانہ سے کم تکلیف دہ نہ تھا۔ مگر بھلا ہو بچارے سنت لال کا وہ اپنی قلیل آمدنی میں بھی ان غریبوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا تھا۔ اگر سوشیلا شروع ہی سے افلاس کی عادی ہوتی تو چکی پیستی یا کسی کا کھانا پکا کر گزارا کرتی مگر خوشحال ماں باپ کی لاڈلی بیٹی اور خوشحال شوہر کی بیوی، یہ کام اسے ذلیل معلوم ہوتے تھے، پھر اپنے مرحوم شوہر کے وقار کا بھی تو خیال تھا۔ حیثیت سے گر کر رہنے میں کتنی سبکی تھی۔ لوگ یہی کہتے یہ سیٹھ رام ناتھ کی بیوی ہے۔ کل کیا تھے آج کیا ہوگئے اس نام کی لاج رکھنی ہی تھی۔ سماج کی سخت گیریوں سے کسی طرح بھی نجات نہیں۔ لڑکی کے دو ایک زیور بچ گئے تھے وہ بھی بک گئے۔ جب روٹیوں ہی کے لولے تھے تو گھر کا کرایہ ماہوار کہاں سے آتا۔ تین مہینے تک تو مالک مکان نے کسی طرح صبر کیا وہ بھی اسی برادری کا ایک فرد تھا جس نے ضیافت میں خوب بڑھ چڑھ کر ہاتھ مارے تھے اور سوشیلا کی زبوں حالی سے واقف تھا۔ مگر بیچارہ کہاں تک صبر کرتا۔ تیس روپے کا معاملہ تھا۔ روپیہ آٹھ آنے کی بات، نہ تھی، اتنی بڑی رقم تو نہیں چھوڑی جا سکتی۔

آخر جب چوتھا مہینہ لگ گیا تو ایک دن سیٹھ جی نہ نفس نفیس وارد ہوئے اور سانڈ کی طرح ڈکارتے ہوئے بولے۔ اگر تو کرایہ نہیں دے سکتی تو گھر خالی کردے۔ میں نے برادری کے ناطے اتنی مروت کی لیکن تو پروا نہیں کرتی۔ کھاتی ہے پیتی ہے، کپڑے پہنتی ہے پھر گھر کا کرایہ دیتے ہوئے کیوں نانی مرتی ہے۔ بچارے رام ناتھ کی آتما کو بدنام کر رہی ہے۔

سوشیلا دردناک لہجہ میں بولی ’’میرے پاس روپے ہوتے تو آپ کا کرایہ ادا کر کے تب پانی پیتی۔ آپ نے اتنی مروت کی، اسی لیے میرا سر آپ کے قدموں پر ہے۔ لیکن ابھی میں بالکل تنگدست ہوں یہ سمجھ لیجیے کہ بس ایک بھائی میرے بچوں کی پرورش کر رہے ہیں اور کیا کہوں۔‘‘

سیٹھ جی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے، پورنماشی کو ہمیشہ ست نرائن کتھا سنتے تھے اب اور کہاں تک دھرم کے نام کو روتے۔ غضب ناک ہو کر بولے۔ ’’چل چل اس طرح کے بہانے بہت سن چکا ہوں۔ میں برادری کا آدمی ہوں نہ اس لیے چاہتی ہے کہ مجھے چُوس لے، اگر کوئی اور ہوتا اُسے چپکے سے مہینے مہینے کرایہ دیتی،

نہیں تو اس نے نکال باہر کیا ہوتا۔ میں برادری کا ہوں مجھے کرایہ دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے مانگنا ہی نہ چاہیے۔ کیوں برادری کے ساتھ یہی سلوک، اسی کے سایہ میں رہتی ہے اسی کی جڑ کھودتی ہے۔''

ریوتی بھی کہیں سے کھیلتی ہوئی آ کر کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ جی نے اسے سر سے پاؤں تک مبصرانہ انداز سے دیکھا اور تب ذرا رقیق ہو کر بولے ''اچھا تو یہ لڑکی سیانی ہو گئی۔ کہیں اس کی سگائی کی بات چیت نہیں کی۔''

ریوتی شرم کر بھاگ گئی۔ سوشیلا نے ان الفاظ میں ہمدردی کی جھلک پا کر پر اعتماد لہجہ میں کہا ''ابھی تو کہیں بات چیت نہیں ہوئی سیٹھ جی، گھر کا کرایہ تک تو ادا نہیں کر سکتی۔ سگائی کہاں سے کروں، پھر ابھی چھوٹی بھی تو ہے۔''

سیٹھ جی نے فوراً شاستروں کا حوالہ دیا۔ ''لڑکیوں کی شادی بارہ سال کے اندر کر دینی چاہیے۔ شاستروں کی یہی منشا ہے، دھرم سب کے لیے ایک ہے۔ کیا غریب، کیا امیر، اس کا نیر اور نہ کرنا چاہیے کرایہ کی کوئی بات نہیں ہے، پھر دے دینا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ سیٹھ رام ناتھ کی کنیا ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔''

سوشیلا کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔ بولی ''تو آپ کی نگاہ میں کوئی اچھا لڑکا ہے یہ تو آپ جانتے ہیں میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں ہے۔''

سیٹھ جھابر مل جی (آپ کا یہی مبارک نام تھا) کی مردانہ حمیت جوش میں آ گئی۔ آواز میں قند و شکر گھول کر بولے۔ ''لینے دینے کی کوئی بات نہیں بائی جی سیٹھ رام ناتھ بھائی تھے ان کی کنیا کنواری بیٹھی رہے یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایسا گھر ہے کہ لڑکی زندگی بھر آرام سے رہے گی۔ تمہارا لڑکا بھی وہیں رہے گا۔ اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ بس یہی سمجھ لو کہ تمہارے نصیب کھل جائیں گے۔ گھرانہ بہت ہی شریف اور اونچا ہے۔ ہاں لڑکا دوہاجو ہے۔''

''عمر اچھی ہونی چاہیے، دوہاجو ہونے سے کیا ہوتا ہے۔''

''عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ابھی چالیسواں سال ہے دیکھنے میں تیس ہی کا لگتا ہے ہٹا کٹا مضبوط آدمی ہے اور مرد کی عمر تو اس کی غذا ہے اچھی غذا ملتی جائے تو عمر کی پروا نہیں، بس یہ سمجھ لو کہ تمہارا بیڑا پار لگ جائے گا۔''

سوشیلا تشویشناک لہجہ میں بولی، ''اچھا یہ سوچ کر جواب دوں گی۔ ایک بار مجھے دکھا دینا۔''

سیٹھ جھابر مل جی مسکرا کر بولے۔ ''دیکھنے کو کہیں جانا ہے بائی جی! وہ تیرے سامنے ہی کھڑا ہے۔''

سوشیلا کے منہ پر طمانچہ سا پڑ گیا۔ نفرت آمیز نظروں سے سیٹھ کو دیکھا۔ یہ پچاس سال کا بوڑھا کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس، سینہ کا گوشت لٹک کر ناف تک آ پہنچا ہے۔ ٹھوری سینے کا بوسہ لے رہی ہے، دانت کے ستون جیسے کوئٹہ کے زلزلے میں منہدم ہو گئے ہیں اور اس پر یہ بڑ بھس، یہ احمق سمجھتا ہے کہ میں لالچ میں آ کر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے میں باندھ دوں گی، میں اسے عمر بھر کنواری رکھوں گی پر اس

مرد کے ساتھ اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد نہ کروں گی، مگر اس نے ضبط کیا یہ زمانہ کی خوبی ہے کہ ایسے گھوسٹوں کو اس کی بے کسی کو ذلیل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

بولی۔ ''آپ کی اس عنایت کے لیے آپ کی مشکور ہوں۔ سیٹھ جی، مگر میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے نہیں کر سکتی۔''

جھابرمل تند ہو کر بولے ''تو اور کیا سمجھتی ہے کہ تیری لڑکی کے لیے برادری میں کنوارا لڑکا مل جائے گا۔''

''تو میری لڑکی کنواری ہی رہے گی۔''

''سیٹھ رام ناتھ کے نام کو داغ لگائے گی۔''

''نام کے لیے اپنی ساری جائیداد کھوئی، زیور کھوئے، مکان کھویا، لیکن لڑکی کو کنوئیں میں نہیں ڈال سکتی، نام رہے یا جائے۔''

''تو پھر میرا کرایہ اسی وقت دیدے۔''

''ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

جھابرمل اسی غیظ کے عالم میں مکان کے اندر گھس گئے اور خانہ داری کی ایک ایک چیز نکال کر گلی میں پھینک دی۔ گھڑا پھوٹ گیا۔ مٹکے چور چور ہو گئے۔ برتن ٹوٹ گئے۔ صندوق کے کپڑے بکھر گئے، چیتھڑوں کو جوڑ کر ریوتی نے کھیلنے کے لیے خوب صورت سی گڑیا بنا رکھی تھی اس کے اعضاء منتشر ہو گئے اور اس کے ریزے ریزے ہوا میں اُڑ گئے۔ سوشیلا ایک بے حسی کے عالم میں دور کھڑی اپنی تباہی کا یہ جگر دوز نظارہ دیکھتی رہی۔ گھر کو خاک میں ملا کر جھابرمل نے مکان میں قفل ڈال دیا اور عدالت سے روپے وصول کرنے کی دھمکی دے کر چلے گئے۔

(6)

بڑوں کے پاس دولت ہے۔ چھوٹوں کے پاس دل ہوتا ہے۔ دولت سے عالیشان محل بنتے ہیں۔ عیاشیاں ہوتی ہیں، مقدمہ بازیاں کی جاتی ہیں۔ رعب جتایا جاتا ہے اور انسانوں کو کچلا جاتا ہے۔ دل سے ہمدردی ہوتی ہے، زخم پر مرہم رکھا جاتا ہے اور آنسو نکلتے ہیں۔

اسی مکان سے ملی ہوئی ایک سبزی والی کنجڑن کی دکان تھی، بوڑھی، بیوہ، ضعیف بے اولاد تھی۔ ظاہر میں آگ باطن میں پانی۔ جھابرمل کو خوب صلوٰتیں سنائیں اور سوشیلا کی ٹوٹی پھوٹی بکھری ہوئی کام کی چیزوں کو سمیٹ کر اپنے گھر میں لے گئی اور پیار سے بولی۔ ''تم چل کر میرے گھر میں رہو بہو ملاحظہ میں آ گئی نہیں نگوڑے کی مونچھیں اکھاڑ لیتی، موت سر پر ناچ رہی ہے آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ موا پیسے کے لیے مرا جاتا ہے جانے چھاتی پر لاد کر لے جائے گا۔ چار دن میں گنگا میں جائیں گے انہیں بیاہ کی دھن سوار ہے پیسہ پا کر آدمی کی آنکھیں بھی اندھی ہو جاتی ہیں کیا؟ تم آرام سے گھر میں رہو میرے ہاں کسی بات کا کھٹکا نہیں۔ بس میں اکیلی ہوں، ایک ٹکڑا مجھے بھی دے دینا۔''

سوشیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔''ماتاجی میرے پاس ان ٹوٹے پھوٹے سامانوں کے سوااور کچھ نہیں ہے۔کرایہ کہاں سے دوں گی؟''

بڑھیامادرانہ شفقت سے بولی۔''میں جھابرمل نہیں ہوں بیٹی،نہ کبیر داس ہوں۔میں تو دیکھتی ہوں اچھے بڑے دن سب کے آتے ہیں۔سکھ میں اتراؤمت،دکھ میں گھبراؤمت۔تمھیں اس دن بھی دیکھا تھا جب تم محل میں رہتی تھیں،اور آج بھی دیکھ رہی ہوں۔جب تم اناتھ ہو۔جومزاج جب وہی اب ہے، میرے دھن بھاگ کہ تم میرے گھر میں آؤ۔میری آنکھیں کیا پھوٹ گئی ہیں کہ میں سے کرایہ مانگنے جاؤں گی۔''

ان تشفی سے بھرے ہوئے الفاظ نے سوشیلا کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔اس نے آج دیکھا سچی انسانیت اورمحبت غریبوں،رذیلوں ہی میں رہتی ہے،بڑوں کا دل بھی بڑابُرا ہوتا ہے تکبراور خودنمائی سے پُر۔

اس کنجڑن کے ہاں رہتے سوشیلا کو چھ مہینے ہو گئے تھے۔اس کی مادرانہ اُلفت میں سوشیلا کا اپنارنج وغم بہت کچھ بھول گیا تھا۔وہ جو کچھ پانی لاکر سوشیلا کے ہات پر رکھ دیتی دونوں بچے اس کی دو آنکھیں تھیں۔ مجال نہ تھی کہ پڑوس کا کوئی آدمی انہیں ترچھی آنکھوں سے دیکھ سکے،بڑھیا آسمان سر پراُٹھالیتی۔سنت لال ہر مہینے کچھ نہ کچھ لایا کرتا تھا۔اس نے فراغت کے ساتھ گزر ہو جاتی تھی۔سوشیلا گھر کی مالکن تھی۔

کاتک کا مہینہ تھا۔فصلی بخار پھیلا ہوا تھا۔موہن ایک دن ہنستا کھیلتا بیمار پڑ گیا اور تین دن تک بے ہوش رہا۔بخار اتنی شدت کا تھا۔کہ پاس کھڑے ہونے سے لپٹ سی لگتی تھی۔سوشیلا کو ٹائیفا ئڈ کا اندیشہ تھا۔اس کی جان سوکھی جاتی تھی،کیا کرے،کس سے کہے۔

پانچویں دن اس نے ریوتی سے کہا۔''بیٹی تونے پنچ جی کا گھر دیکھا ہے،جا کران سے میرا پرنام کہنا اور کہنا کہ بھیا کو پانچ دن سے زور کا بخار ہے،چھن بھر کو بھی نہیں اُترتا۔کوئی ڈاکٹر بھیج دیجیے۔''

ریوتی کو کہنے کی دیر تھی۔دوڑی ہوئی سیٹھ کبیر داس کے پاس گئی،کبیر داس نے حال سنا اپنے منیم سے بولے''ایس احکم بھیجتی ہے جیسے میں اس کے باپ کا نوکر ہی تو ہوں۔کھانے کو ٹھکانا نہیں۔انہیں ڈاکٹر چاہیے۔چڑیل۔''

ریوتی سے بولے۔''جا کر کہہ دے،ڈاکٹر کی فیس سولہ روپے ہو گی راضی ہو تو بھیج دوں۔''

ریوتی نے دل شکستہ ہوکر کہا۔''اماں کے پاس روپے کہاں ہیں سیٹھ جی!''

کبیر داس جھڑک کر بولے۔''تو پھر کس منہ سے ڈاکٹر بھیجنے کو کہتی ہے۔تیرا ماموں کہاں ہے۔اس سے جا کر کہہ،سیوا سمتی سے کوئی ڈاکٹر بلا لے جا۔یا خیراتی ہسپتال میں کیوں نہیں لڑکے کو لے جاتی یا ابھی وہی پرانی بوسائی ہے۔کتنی بے سمجھ عورت ہے گھر میں ٹکا نہیں،ڈاکٹر کی فرمائش کر دی۔فیس پنچ جی دیں گے،پنچ جی کیوں فیس دیں۔پنچایت کا مال دھرم کاج کے لیے ہے۔یوں اڑانے کے لیے نہیں۔شہر کے لاکھوں آدمی اسپتال میں اچھے ہو جاتے ہیں۔پھر یہ کہاں کی بڑی رانی ہیں۔ابھی بھاگوت کی کتھا بیٹھنے والی

ہے کئی ہزار کا خرچ ہے۔ اس طرح ہر ایک کے لیے ڈاکٹر بھیجنے لگوں تو ثواب کا کوئی ہی نہ ہو۔''

ریوتی آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹی، مگر جو کچھ سنا تھا وہ کہہ کر ماں کے زخم پر نمک نہ چھڑکنا چاہتی تھی۔ بہانہ کر دیا۔ سیٹھ ملے نہیں۔ کہیں باہر گئے ہیں۔

سوشیلا نے ڈانٹ کر کہا ''تو نے منیم جی سے کیوں نہیں کہا۔ یہاں کوئی مٹھائی رکھی تھی جو دوڑی ہوئی آ گئی۔''

اسی وقت سنت لال ایک وید کو لے کر آئے۔

(7)

مگر وید جی ایک دن آ کر دوسرے دن نہ لوٹے۔ جب پوری فیس کی جگہ آدھی بھی نہ ملے اور نہ اس تعلق سے کسی موٹے مریض کے پھنسنے کی امید ہی ہو تو پھر وہ کس تحریک سے روز آئیں۔ سیوا سمتی کے ڈاکٹر صاحب بھی دو دن بڑی منتوں سے آئے پھر انہیں بھی فرصت نہ رہی۔ جھابرمل کو بخار آنے لگا تھا اور جھابرمل برادری کے ذی اثر آدمی ان کے معالجے میں ہر طرح کا فائدہ تھا۔

ادھر موہن کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ ایک مہینہ یوں ہی گزر گیا مگر بخار نے اترنے کا نام نہ لیا۔ پیرتسمہ پا کی طرح گردن پر سوار ہو گیا تھا کہ ہلتا تک نہ تھا۔ موہن کا چہرہ اتنا زرد اور افسردہ ہو گیا تھا گویا خون کا ایک قطرہ جسم میں نہ ہو، اُسے دیکھ کر رحم آتا تھا۔ لمبا سا چہرہ نکل آیا تھا جس سے طفلانہ بیکسی روتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نہ کچھ بولتا نہ کہتا۔ یہاں تک کہ کچھ سنتا بھی نہ تھا۔ پڑا پڑا بے نور آنکھوں سے چھت کی طرف تاکتا رہتا۔ پڑے پڑے جلد میں خراش ہو گیا تھا۔ سر کے بال گر گئے تھے۔ ہاتھ پاؤں لکڑی جیسے، چارپائی پر ایسا سمٹا ہوا تھا گویا ہے ہی نہیں، تصویر مٹ گئی صرف اس کا عکس باقی تھا۔ ماں رات دن اس کی تیمارداری میں لگی رہتی۔ بڑھیا بھی دعائیں دیا کرتی مگر تیمارداری اور دعا سے دوا کا کام تو نہیں ہو سکتا۔

ایک دن شام کے وقت موہن کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ سوشیلا تو پہلے ہی سے ٹھونک رہی تھی، یہ حالت دیکھتی تو چھاتی پیٹنے لگی، اسے بے بسی میں کچھ اور نہ سوجھا، کھڑی ہو گئی اور موہن کے کھاٹ کے گرد سات بار گھوم کر دست بدعا ہو کر بولی۔ ''بھگوان یہی میری اس جنم کی کمائی ہے اپنا سب کچھ کھو کر بھی اپنے لال کو چھاتی سے لگائے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر تھی۔ یہ چوٹ نہ سہی جائے گی۔ تم اسے اچھا کر دو۔ اس کے بدلے مجھے اٹھا لو۔ بس میں تمہاری اتنی ہی دیا چاہتی ہوں۔''

غیب کے کرشمے کون سمجھ سکتا ہے، کیا ہم میں سے بہتیروں کو اس کا تلخ تجربہ نہیں کہ جس دن ہم نے بے ایمانی سے کوئی رقم اڑا دی اسی دن ہمیں اس رقم کا دوگنا نقصان اٹھانا پڑے اسے اتفاق کہو یا دعا کا اثر، اسی رات کو موہن کا بخار اتر گیا اور سوشیلا کو بخار آ گیا۔ بچے کی تیمارداری میں آدھی تو یوں ہو رہی تھی بخار نے ایک ہی جھٹکے میں بستر مرگ پر سلا دیا۔ معلوم نہیں دیوتا بیٹھے سن رہے تھے یا کیا اس کی دعا حرف بحرف پوری ہوئی۔ تیسرے دن موہن چارپائی سے اٹھا اور ماں کے پاس جا کر اس کی چھاتی پر سر رکھ کر رونے